ے بنی اسرائیل کو دنیا جہان میں جو بلند و بر تر مقام عطا ہونے والا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی دنیا جہان والوں پر فضیلت' اس کی مناسبت سے تربیت ضروری تھی۔ ظاہر ہے کہ تربیت کا زمانہ سخت ہوتا ہے اس میں بڑی آزمائشیں ہوتی ہیں اور سخت قسم کے قوانین سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ قوانین اگرچہ عارضی ہوتے ہیں لیکن تربیت کے کورس میں ان کے بغیر چارہ نہیں ہوتا ہے اس بلند و بر تر مقام کے لئے جس قسم کی تربیت ضروری ہوتی ہے اس کو سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی سے مدد ملے گی۔ تربیت کے پروگرام کا ایک حصہ اضطراری یعنی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے جس سے چار و ناچار گزرنا پڑتا ہے اور ایک حصہ اختیاری ہوتا ہے یعنی اس کا حکم دیا جاتا ہے جس میں کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے لیکن اس کو کئے بغیر تربیت کی بات نہیں پوری ہوتی ہے۔ بچھڑے کی پرستش کے بدلہ جانوں کو مارنے کا حکم اختیاری تھا اور یہ جانچنے کے لئے تھا کہ لوگوں کو اپنے فعل پر واقعی شرمندگی ہے یا صرف زبانی شرمندگی ہے۔ اگر صرف زبانی توبہ کو کافی سمجھا جاتا اور عملی توبہ کی یہ شکل نہ تجویز کی جاتی تو ایک طرف اندرونی زندگی میں وہ تبدیلی نہ ہوتی جو اس سے مقصود تھی اور دوسری طرف توبہ کی اہمیت گھٹ جاتی۔ جس قوم کو اللہ نے ایسے معجزانہ انداز میں چند ہی دن پہلے سمندر سے پار کیا اور اس کے دشمن کو نیست و نابود کر دیا وہی قوم قدرت کے فیصلہ کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے بغاوت و سرکشی پر اتر آئی ظاہر ہے کہ اس کے زبانی توبہ کی کیا حیثیت ہو گی؟ پھر ایسا نہیں ہوا بچھڑے کی پرستش کرنے والے تمام لوگوں کو ان لوگوں نے قتل کیا ہو۔ جنہوں نے پرستش نہیں کی تھی بلکہ کچھ لوگوں کے قتل کے بعد جب اندازہ ہو گیا کہ واقعی ان کو اپنے فعل پر شرمندگی ہے تو بقیہ لوگوں کو اللہ نے معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول کر لی جس کا ذکر اوپر کی آیت ثُمَّ عَفَوْنَا (پھر ہم نے معاف کر دیا) میں اور اس آیت فَتَابَ عَلَيْكُمْ (اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی) میں موجود ہے۔

قتل کا یہ واقعہ تورات میں ہے بنی اسرائیل کی تاریخ میں مشہور ہے مفسرین نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اس کا ذکر کیا ہے' اس کے باوجود قتل کو اصلی معنی سے ہٹا کر اس کے معنی ریاضت و مجاہدہ یا نفس کشی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے جیسا کہ نئے زمانہ کے بعض مفسرین نے کہا ہے۔

اصل غلطی قومی و جماعتی زندگی اور اس کے تربیتی پروگرام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ طبیعت کی سختی و نرمی سمجھ کی بلندی و پستی اور عقل میں کمی و بیشی کے لحاظ سے پہلی قوموں کو بالکل ویسا ہی سمجھ لیا جاتا ہے جیسا کہ آج کی قومیں ہیں پھر ان کی مناسبت سے جو تربیتی پروگرام تجویز ہوتا ہے آج کی قوموں کے وہ مناسب نہیں نظر آتا ہے تو اس کا انکار کر دیا جاتا ہے اور پھر عذر و معذرت کی وہ روش اختیار کی جاتی ہے جس سے خود اپنی پستی اور اپنے ذہن و فکر کے زوال کا پتہ چلتا ہے۔ ☆ ☆

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعے کے ضمن میں —

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیّہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۲ روپے

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کی تاریخ میں
عقل اور نقل کی کشمکش
کے دو اہم دور ـــــ اور
برصغیر میں علی گڑھ اور دیوبند کے دو متضاد مکاتبِ فکر کا قیام

اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کا نزاع تقریباً ابتداء ہی سے چلا آ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ "مذہب" اپنی اصل کے اعتبار سے "نقل" ہے جو اولاً فرشتے کی وساطت سے خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا اور پھر ان کی ذات گرامیؐ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے لہٰذا اس کی اساس "نقل" پر ہے نہ کہ "عقل" پر ..... لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب انسان ہیں جو چاہے تمام کے تمام "ذوی العقول" نہ ہوں۔ لیکن پیروی چونکہ وہ اپنی اسی اقلیت کی کرتے ہیں جو "ذی العقل" ہوتی ہے لہٰذا انسان پر بحیثیت مجموعی حیوانِ عاقل کا اطلاق غلط نہیں ہے۔ بنابریں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ بالکل ابتداء ہی سے مذہب کے "نقل" کو "عقل" پر پرکھنے اور اس کی عقلی توجیہہ کرنے کی کوششیں ہوتی چلی آئی ہیں اور اس کے نتیجے میں ہر دور کی عقلی و فکری سطح کے مطابق علمِ کلام کا ذخیرہ تیار ہوتا رہا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست صحبت کی بدولت جو ایمان حاصل ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے اور کسی غیر صحابی کے ایمان کو اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ انہیں علم الیقین ہی نہیں حق الیقین کی جو کیفیت حاصل تھی اس میں استدلال کا عنصر اول تو تھا ہی بہت کم، اور جتنا تھا اس کی اساس بھی فطرت کے نہایت محکم لیکن سادہ دلائل پر تھی نہ کہ کسی

پیچ در پیچ منطقیانہ قیل و قال پر یہی وجہ ہے کہ یہ بات بالکل غیر مبہم طریق پر واضح کر دی گئی ہے کہ امت کے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کے ایمان کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے قلوب جس نورِ ایمان سے منور تھے اور ان کے سینے جس حرارتِ ایمانی سے معمور تھے ان کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کا "دلِ روشن" اور "نفسِ گرم" نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایمان نے ایک ایسے بے تابانہ جذبے اور والہانہ عشق کی صورت اختیار کر لی تھی جو ہر دم عمل کی بھٹیوں اور آزمائشوں اور ابتلاؤں کے الاؤں میں کودنے کو اس طرح آمادہ و تیار رہتا ہے کہ عقل بے چاری کے لئے "محو تماشائے لبِ بام" رہنے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔[1]

دورِ صحابہؓ کے اختتام کے ساتھ ہی فطری طور پر ایمان کی ان کیفیات میں انحطاط و اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا اور "عشق کی آگ" ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی۔ نتیجۃً فوراً عقل کے قیل و قال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ آج تک جاری ہے۔ اس عرصے میں "عقل" پر کئی دور آئے اور ہر دور میں اس کے صغریٰ و کبریٰ بدلتے رہے، لیکن مذہب کے "نقل" کے ساتھ اس کا تصادم مسلسل جاری رہا۔ اور یہ پینترے بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوتی رہی۔ دوسرے طرف سے حامیان و حاملانِ نقل اس کی جانب سے مدافعت کرتے رہے اور اس طرح اسلام کی پوری تاریخ میں عقل اور نقل کے باہمی نزاع کا سلسلہ چلتا رہا۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ مذہب کے نقل کی کامل عقلی توجیہہ نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی اس کی وجہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ عقل انسانی نہایت محدود ہے اور زمان و مکان اور ظروف و احوال کے بہت سے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے جبکہ دین و مذہب کی اساس جن

---

[1] یہ وہ 'محالِ عقلی' ہے جس کا منطقی امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس وقت جب علمِ انسانی ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے لئے حقیقتِ نفس الامری بالکل کھل جائے اور حقائقِ اشیاء بالکل 'کما ھی' روشن ہو جائیں..... اور ظاہر ہے کہ یہ صرف آخرت میں ہو سکے گا۔!!

[2] اسی کی ایک ادنیٰ مثال ہے حضرت خالدؓ کا وہ قول جو انہوں نے غیر مسلم افواج سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "لوگو! تمہارا سابقہ اس قوم سے ہے جو موت کو اسی قدر عزیز جانتی ہے جس قدر تم زندگی کو!"

وراء الوراء حقائق پر ہے وہ غیر محدود بھی ہیں اور نہایت لطیف بھی..... شریعت کے اوامر و نواہی کے اسرار و حکم کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میدان میں عقل اپنی جولانیاں جتنی چاہے دکھالے' ایمانیات و اعتقادات کی سرحد شروع ہوتے ہی معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایمان جن غیر محدود' لطیف اور وراء الوراء حقائق کے مجموعے کا نام ہے ان کا مجرد نطق انسانی کی گرفت میں آنا بھی نہایت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے' (تبھی تو اس مقام پر خود آسمانی کتابوں کو بھی اشاروں' کنایوں' استعاروں اور تمثیلوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے!) ..... کجا یہ کہ انہیں ہر دور کی عقلی سطح پر وقت کے فلسفہ و منطق کے غایت درجہ محدود سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے!!

چنانچہ..... یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ عقائد اسلامی کی عقلی توجیہہ کی کوششوں سے بعض اوقات شدید نقصان بھی پہنچا۔ وقت کے فلسفوں کی کسوٹی پر پرکھنے میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض حقیقی اجزاء کو کھوٹا بھی سمجھ لیا گیا اور وقت کی منطق کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض پہلو مجروح بھی ہوئے.....

اس کے مقابلے میں "محفوظ" راستہ ہمیشہ ان ہی کا رہا جنہوں نے محض نقل پر اکتفا کیا۔ اسی کو سینے سے لگائے رکھا' اسی کے تحفظ میں زندگیاں کھپا دیں اور اسے جوں کا توں اگلی نسل تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے..... بایں ہمہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا چونکہ مذہب کے نقل کی عقلی توجیہہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے لہٰذا ہر دور میں دین و مذہب کے مخلصین اس کے لئے کوشاں رہے اور خود اپنے دین و ایمان کے لئے خطرات مول لے کر بھی اس خطرناک مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ بات بالکل واضح طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ ایسے لوگوں کی ان تمام کوششوں کا اصل محرک نُصح و نصرت دین ہی کا جذبہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ گمان کہ وہ دین و مذہب کے دشمن تھے یا ان کا مقصد ہی اسلام کو گزند پہنچانا تھا ایک شدید قسم کی زیادتی و ناانصافی ہے!

اصحابِ نقل کی جانب سے فطری طور پر ہر دور میں اصحاب عقل پر نکیر بھی ہوتی رہی لیکن اس کی بھی ہمیشہ دو سطحیں رہیں۔ ایک عوامی سطح جس پر مجرد ردّ و انکار اور اصحاب عقل کی

موشگافیوں سے بیزاریٔ محض کا اظہار ہوتا رہا اور دوسرے علمی سطح پر، ایسے لوگوں کے ذریعے جنہوں نے اپنے دور کے فلسفہ و منطق، علوم و فنون اور افکار و نظریات کے چشموں سے پوری طرح سیراب ہو کر اور اس طرح وقت کے عقلی معیار پر کاملاً پورے اُتر کر..... اور پھر خود ذہنی و عقلی اور قلبی و روحانی ہر اعتبار سے مذہب کے نقل پر مطمئن ہو کر اصحابِ عقل پر مدلّل تنقید کی۔ درحقیقت دین و مذہب کا اصل دفاع ہر دور میں ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس لئے کہ لوہا لوہے ہی سے کاٹا جا سکتا ہے اور عقل کا توڑ عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے!

☆ ☆ ☆

دورِ اوّل۔ اسلام کی تاریخ میں "عقل" اور "نقل" کا پہلا نزاع اس وقت برپا ہوا جب اسلام کے اصحابِ عقل نے یونان کے فلسفے اور ارسطو کی منطق کے زیر اثر اسلام کی عقلی توجیہہ کی کوششیں شروع کیں اور اس کے نتیجے میں اسلام کے اساسی ایمانیات و اعتقادات کے ضمن میں منطقی موشگافیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ عقل و نقل کی وہ جنگ شروع ہوگئی جس کا آغاز تو اگرچہ دورِ اُموی کے آخری زمانے میں ہو گیا تھا لیکن جو اپنے پورے شباب کو دور عباسی میں پہنچی۔ اس جنگ میں اوّل اوّل دو بالکل انتہائی نقطہ ہائے نظر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کی کامل ضد تھے۔ چنانچہ "عقل خالص" نے معتزلہ کا روپ دھارا اور "نقل محض" نے اصحاب ظاہر کی صورت اختیار کی، لیکن رفتہ رفتہ اس "آویزش" میں "آمیزش" کا رنگ بھی پیدا ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معتدل نظام ہائے اعتقادی وجود میں آئے اور اشعری و ماتریدی عقائد باقاعدہ مرتّب و مدوّن ہوئے اور عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے ان کے گوشۂ عافیت میں پناہ لی۔ خالص علمی سطح پر یہ نزاع بعد میں بھی جاری رہا اور امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ ایسے اصحابِ فکر و نظر عقلیت پرستی پر شدید "عقلی" ضربیں لگا کر "نقل" کے دفاع کا موثر بندوبست کرتے رہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ معتزلہ اور اصحاب ظاہر کے تصادم کے نتیجے میں جو معتدل "مسلکِ اہلِ سنت" اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نظام ہائے اعتقادی کی صورت میں ظاہر ہوا اُس کا اصل تانا بانا بھی وقت کے فلسفہ و منطق ہی سے تیار ہوا ہے جس میں ایمان کے لازوال اور ابدی حقائق خوبصورتی کے ساتھ بُن دیئے گئے ہیں۔ گویا کہ اسے عقل اور نقل کا ایک حسین امتزاج قرار تو دیا جا سکتا ہے لیکن اِن تصریحات کے ساتھ

کہ ایک تو اس میں اس مئے حقیقت کو جو لازوال ولافانی اور ازلی وابدی ہے عقل و منطق کے اُن پیمانوں میں پیش کیا گیا ہے جو بالکل عارضی اور وقتی ہیں، دائمی و مستقل نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ان عقائد کے منطقی و کلامی طرز بیان میں "حقیقت ایمان" بتمام و کمال سمودی گئی ہے۔

ان عقائد کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک خاص دور کی عقلی سطح پر اور اس وقت کے متداول منطقی اصطلاحات میں "حقائق ایمان" کی امکانی حد تک ترجمانی قرار دیا جاسکتا ہے اور بس!

دوسرے یہ کہ اس وقت بھی مذہب کا دفاع اور عقل و نقل کا یہ امتزاج صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ممکن ہو سکا تھا جو بیک وقت صاحب عقل بھی تھے اور حامل نقل بھی۔ بالکل یک رخے لوگ اس کام کے لئے اس وقت بھی بے کار تھے۔ چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے مصنفؒ خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے۔ اور "الرد علی المنطقیین" کے مولفؒ خود ایک بہت بڑے منطقی تھے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جو خود وقت کے فلسفہ و منطق کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی گمراہی و کج فہمی کی جڑوں پر مؤثر تیشہ چلا سکے۔

دورِ ثانی ۔ اسلام پر عقلیت کا دوسرا بڑا حملہ آج سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل یورپ کے اس فلسفہ و فکر کے زیر اثر شروع ہوا جس کی تعمیر خالص مادہ پرستی کی اساس پر ہوئی تھی۔ برصغیر ہندو پاک میں یہ جدید "مذہبی عقلیت" متعدد اہلِ فکر و نظر اور صاحبانِ قلم و قرطاس کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ جس میں جسٹس امیر علی کا نام بھی اگرچہ بالکل غیر اہم نہیں، تاہم ہر اعتبار سے اہم ترین نام سرسید احمد خاں مرحوم کا ہے۔ فکر اسلامی کے اس دور میں ان حضرات کا مقام بالکل وہی ہے جو دور قدیم میں اولین معتزلہ کا تھا۔ یعنی مذہب کے نقل کے مقابلے میں عقل کی بالکل دوسری انتہا پر!

سرسید مرحوم کا ملت اسلامی کے ساتھ اخلاص تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے ہی واقعہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے ساتھ مخلصانہ تعلق میں شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ..... نماز روزے کے معاملے میں وہ متشدد "وہابی" تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں ایسا والہانہ تعلق خاطر تھا کہ جب ۶۴-۱۸۵۸ء میں سر ولیم میور کی کتاب "حیاتِ محمدؐ" شائع ہوئی۔ جس میں آنحضورؐ کی سیرت مبارکہ پر رکیک حملے کئے گئے تھے تو وہ سخت بے چین

اور مضطرب ہوگئے اور بقول اُن کے ان کا "جگر خون ہو گیا" اور انہوں نے لندن سے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں اس کی اشاعت کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی، تم اول تو راجہ جے کشن داس سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ورنہ میری علی گڑھ والی کوٹھی فروخت کر دو!"..... بایں ہمہ ان پر مغربی علوم و فنون اور خاص طور پر جدید سائنس کا ایسا رعب تھا اور مادّہ پرستانہ نقطہ نظر ان پر اس قدر غالب آگیا تھا کہ ان کی عینک سے جب انہوں نے دین و مذہب کا مطالعہ کیا تو اس کی بہت سی چیزیں انہیں ایسی نظر آئیں جن کو "ماننے" کے بعد اہل مغرب سے آنکھیں چار کرنا ان کے نزدیک دشوار تھا۔ چنانچہ دین و مذہب کی خیر خواہی انہیں اسی میں نظر آئی کہ ایسی چیزوں کی حتی الامکان تو عقلی و سائنٹفک توجیہہ کر دی جائے اور جن چیزوں کی توجیہہ کسی طرح ممکن نہ ہو، ان کا انکار کر دیا جائے۔

چنانچہ ملائکہ محض قوائے طبعیہ (FORCE OF THE NATURE) قرار پائے۔ جن انسانوں ہی میں سے اجڈ، گنوار اور مشتعل مزاج لوگ ٹھہرے، معجزات کی خالص طبعی (PHYSICAL) توجیہہ ہوئی۔ جنت اور دوزخ کو مقامات (PLACES) نہیں بلکہ صرف کیفیات (STATES) قرار دیا گیا۔ مذہبی رواداری کا راگ الاپا گیا۔ اور جہاد کے بارے میں معذرت خواہانہ روش اختیار کی گئی۔ دنیوی ترقی و عروج نظریات و افکار کی صحت کے ثبوت گردانے گئے اور مغربی تہذیب و تمدن اور طرز بود و باش کو مسلمانوں کے جملہ قومی و ملی امراض کا واحد علاج..... اور ان کے عروج و ترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا..... چنانچہ بالکل صاف کہا گیا کہ "مذہب کے علاوہ ہر بات میں انگریز بن جاؤ!"..... اور نوبت بایں جا رسید کہ خود خدا کا تصور بھی حیّ و قیوم، سمیع و بصیر، رحیم و کریم، صاحب ارادہ و مشیت اور غفور و منتقم ہستی کے بجائے سائنس کے علت العلل[1] (THE FIRST CAUSE) کی صورت اختیار کر گیا..... اور وحی و قرآن کے بارے میں جو تصور اختیار کیا گیا اور "بے چارے" جبریل امینؑ کو جس طرح بیک بینی و دو گوش "رخصت" کیا گیا وہ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

---

[1] واضح رہے کہ علّت العلل اور مسبّب الاسباب میں زمین آسمان کا فرق ہے

زجبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوقؔ[1] است قرآنے کے من دارم!

گویا "مذہب" کی مکمل قلب ماہیت ہوگئی اور ہماری اپنی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق مذہب کا خالص "غیر مذہبی" "ایڈیشن" تیار ہوگیا..... بالکل ٹھیک کہا تھا حضرت اکبر الہ آبادی نے کہ ؎

دیکھ کاریگری حضرتِ سیّد اے شیخ
دے گئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

ہم نے سید مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے چند شاہکار اس لئے پیش کر دیئے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت خواہ وہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو خواہ فضل الرحمانیت کی شکل میں درحقیقت فکرِ سرسیّد ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔ سرسید بے چارے تو پھر بھی معذور تھے اس لئے کہ ان کا واسطہ ایک ابھرتی ہوئی فکر کے ساتھ تھا جس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی و عسکری قوت بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رحم تو آتا ہے ان کے ان جدید متبعین پر جو آج ان نظریات کو بڑے فخر کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں درآنحالیکہ مغربی تہذیب کبھی کی "خود اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی" کر چکی، سائنس کی مادہ پرستی کب کی فضا میں تحلیل ہو چکی، اور مغرب کی سیاسی و عسکری بالادستی کی بساط کب کی تہہ ہو چکی۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی ست!

بہرحال اصل اہمیت سرسید کی نہیں فکر سید کی ہے۔ شخص سرسید تو بہت جلد اپنے رب سے جاملا لیکن فکر سرسید دراصل تاریخ اسلامی کا ایک دور ہے جو تاحال جاری ہے۔ سرسید مرحوم نے جو پودا علی گڑھ کی صورت میں لگایا تھا وہ ان کے بعد ایک تناور درخت بنا اور خوب برگ و بار لایا۔ برصغیر میں قائم ہونے والے تمام اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں کا

---

[1] اس شعر میں 'معشوق' کا اطلاق جس طرح آنحضورؐ پر بھی ہوسکتا ہے اور خدا پر بھی بالکل اسی طرح کا قول ہے ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کا کہ "قرآن سارے کا سارا ایک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسولؐ بھی"..... دونوں جگہوں پر اصل انکار جبریل امینؑ کا ہے.....!

تعلق علی گڑھ سے وہی ہے جو روئے زمین کی تمام مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پاک وہند کے تمام جدید تعلیم یافتہ عناصر شعوری طور پر اسی مکتبۂ فکر سے متعلق ومنسلک ہیں جس کی ابتداء سرسید مرحوم نے کی تھی۔

متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا۔ جس نے قال اللہ وقال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا اور اس قوم میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ و دارالعلوم ہی نہیں ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں دین ومذہب کی حفاظت کا موثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی وعملی سوتے پھوٹے۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاسمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی وروحانی، مذہبی وسیاسی اور دعوتی وتبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ اوپر ہی کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی ومذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس ومیلاد اور فاتحہ ودرود تک محدود ہے بقیہ تمام فعال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق ومنسلک ہیں۔

تحریک دیوبند کی ان مختلف شاخوں کے مابین مجموعی مزاج اور دائرہ ہائے کار کا فرق وامتیاز بھی ایک دلچسپ علمی موضوع ہے۔ ان میں اصل عوامی عنصر جو مذہب وسیاست دونوں کا مظہر یا بالفاظ دیگر مذہبی سیاست کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ ذہناً وقلباً "حسینی" ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ذہنی تعلق اور قلبی ارادت وعقیدت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام بھی درحقیقت اسی کا تتمہ یا صحیح تر الفاظ میں ضمیمہ ہے۔ تھانوی اور عثمانی حلقے علمی ذوق اور متصوفانہ مزاج کے حامل ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مولانا یوسف بنوری کا مزاج خالص علمی ہے..... اور تبلیغی جماعت خالص غیر سیاسی وغیر علمی لیکن نہایت پرجوش وفعال مذہبیت کا مظہر ہے..... ان تمام امتیازات کے علی الرغم جہاں تک مذہبی فکر کا تعلق ہے وہ ان سب میں مشترک ہے۔ مذہب کے نقل کے یہ سب ایک سے فدائی ہیں۔ اور